€€€علیہ السلام

ایمان افروز اور سبق آموز کہانیوں کا سلسلہ

آستین کے سانپ

کہانی نمبر 6

کارواں لُٹ گیا

عزام محسن

اساس انسٹیٹیوٹ

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام مجموعہ:	آستین کے سانپ
نام کہانی:	کارواں لٹ گیا
مصنف:	عزام محسن
تعداد:	ایک ہزار
تاریخ:	جنوری 2024
زیرانتظام:	اساس انسٹیٹیوٹ
پبلشر:	اردو سرائے
رابطہ نمبر:	محمد عبداللہ 0334-9363518

دل کی بات

قدرت نے انسان کے سامنے دو راستے رکھے ہیں۔ایک حق اور دوسرا باطل...ایک سچ اور دوسرا جھوٹ...ایک صحیح اور دوسرا غلط...اس وقت دنیا میں جتنی بھی نظریاتی محنت ہو رہی ہے ،اس میں ہر کوئی اپنے آپ کو حق اور سچ کا دعویدار کہتے ہوئے دوسرے کو غلط اور جھوٹ ثابت کر رہا ہے۔

خالقِ کائنات نے اپنی کتاب،قرآن مجید فرقانِ حمید میں حق اور باطل کی نشانیاں واضح کی ہیں ۔حق والوں کا راستہ بھی بتایاہے اور باطل کی ریشہ دوانیوں سے بھی پردہ چاک کیاہے۔باطل نے حق کا راستہ روکنے کے لیے کبھی علی الاعلان اُسے للکارا ہے اور کبھی حق کا جعلی روپ دھار کر بہروپیے کی شکل اختیار کی اور حق والوں کو سیدھے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔اس ساری محنت کے پیچھے نسلِ آدم کا ازلی دشمن ابلیس ہی ہے۔

ابلیس جب سے راندۂِ درگاہ ہوا،تب سے ہی انسان کو گمراہ کرنے پر لگا ہوا ہے۔ایسی صورتِ حال میں انسان کے لیے درست راستے کا انتخاب ضروری اور لازم ہو جاتا ہے۔ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ دراصل خاتم النبین ہیں۔ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی اپنی نبوت کے ساتھ نہیں آئے گا، مگر قدرت کے اس فیصلے سے بغاوت کرنے والے کئی شیطان کے ہرکارے میدان میں آئے،اپنا اپنا منجن بیچا،عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔انہیں میں ایک نام مرزا غلام احمد قادیانی کا ہے جس نے خود کو یسوع مسیح کہتے ہوئے نبوت جیسے عظیم مرتبے کی توہین کی۔

مرزے کی سوچ دراصل ہندوستان میں انگریز سرکار کی طے شدہ پالیسی کا تسلسل تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مرزے کے بدبخت پیروکاروں نے اس نئے اسلامی ملک میں اپنے پنجے گاڑنے

شروع کردیے۔ مگر فدایانِ ختم نبوت کی بیش بہاقربانیوں کی بدولت حکومتِ پاکستان کو انھیں غیر مسلم اور کافر قرار دینا پڑا اور اب ان کا کفر آئینِ پاکستان کا حصہ ہے۔ مگر اس کے باوجود قادیانی اسلام کا لبادہ اوڑھے مسلمانوں کو بہکانے میں مصروف ہیں۔اسی سلسلے میں ادارہ ''اساس'' نے بھرپور انداز میں جواب دیتے ہوئے اہلِ اسلام کو ان کی چالوں سے خبردار کیا ہے۔

قادیانیت کے مکروہ چہرے سے نقاب اتارتے ایسے واقعات، ایسی کہانیاں جو روز کہیں نہ کہیں وقوع پذیر ہوتی ہیں، ادارہ اساس نے انھیں جمع کر کے نئے اسلوب کے ساتھ ''آستین کے سانپ'' کا عنوان دیا ہے۔ یہ کہانیاں مختلف ذیلی عنوانات کے ساتھ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ انھیں خود بھی پڑھیے اور دوسرے مسلمانوں تک پہنچانے میں ہمارے معاون بھی بنیے۔

اساس انسٹیٹیوٹ

کارواں لٹ گیا

آج اُس کی روح سر شار تھی۔ آنکھوں میں ایک خاص چمک لیے وہ جلدی جلدی تیاری میں مصروف تھا۔ گو کہ اُس کا باپ چند سال قبل انتقال کر چکا تھا۔ مگر اُس کی ماں نے اُسے باپ کی کمی کا احساس تک نہیں ہونے دیا تھا۔ غربت کے باوجود اُسے ہر آسائش مہیا کی تھی۔ وہ گاؤں کے قریبی اسکول سے اچھے نمبروں کے ساتھ میٹرک کرنے میں کامیاب ہوا تھا، تو یہ اس کی ماں کی دعا اور بہنوں کی کاوش کے ساتھ ساتھ خود اُس کی اپنی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

پانچ بہنوں میں وہ سب سے چھوٹا اور اکیلا بھائی تھا۔ میٹرک کے بعد اُس کی خواہش تھی کہ وہ چھوٹا موٹا کام کاج کر کے ماں کا ہاتھ ہٹائے، بہنوں کو کچھ آرام دے، جنھوں نے دن رات لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے اسے اس مقام تک پہنچایا تھا۔

مگر ماں اور بہنوں کی خواہش تھی کہ وہ آگے بھی پڑھے، پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن جائے۔ اسے اپنے خاندان کی مشکلات کا ادراک تھا۔ مگر وہ ماں اور بہنوں کی آرزو کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا تھا۔ آج اسی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ تیاری میں مصروف تھا۔ اُسے شہر کے بڑے کالج میں جانا تھا۔ وہاں اس کا داخلہ ہو چکا تھا۔ جاتے جاتے اپنے گاؤں کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہی

وہ گاؤں تھا، جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بچپن میں خوب کھیلا کرتا تھا۔ سبھی لوگ یہاں آپس میں پیار و محبت سے رہتے تھے۔

سواری میں بیٹھتے وقت اچانک اُس کی نظروں میں اپنے مرحوم باپ کا چہرہ گھوم گیا۔ جو غریب تو تھا، مگر خود دار اور انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک بھی۔ جس نے زندگی بھر محنت اور ہمت سے کام لیا تھا۔ جو دین سے محبت کا عملی نمونہ تھا۔ اُسے اپنے شفیق باپ کے راستے پر چلنا تھا۔ اسے اپنے دل کو دماغ کے تابع رکھنا تھا۔ ماں کو الوداع کہتے وقت اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔

بہنوں سے جدائی اسے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہی تھی۔ مگر اسے کچھ خوابوں اور وعدوں کی تکمیل کرنا تھی۔ سو وہ اپنی ماں اور بہنوں کی توقعات اور آرزوؤں کا بوجھ اپنے سر پہ سوار کیے زندگی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ہاسٹل کی زندگی اس کے لیے اجنبی تھی۔ ہمیشہ گھر کے لذیذ کھانوں اور نرم گرم بستروں کے مزے لوٹنے والا بلال توفیق ہاسٹل میں پہلی رات گزار رہا تھا۔ لقمہ اُس کے حلق سے نیچے نہ جاتا تھا۔ اور بستر...؟ جیسے کسی نے کانٹے بچھا دیے ہوں، لیکن رفتہ رفتہ ان چیزوں کا عادی ہونا اس کی مجبوری تھی۔

پندرہ دن بعد جب اپنے گھر بلال کا پہلا چکر لگا، تو ماں سے اس طرح گلے ملا جیسے برسوں کے بچھڑے مل رہے ہوں۔ سلام دعا کے بعد اُسے پتا چلا کہ بڑی بہن فہمیدہ شدید بخار میں مبتلا ہے۔ بہن کے سرہانے بیٹھ کر اس نے اسے حوصلہ اور تسلی دی۔ فہمیدہ اپنے لاڈلے چاند کو یوں تسلیاں دیتے دیکھ کر جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ آخر بہن جو تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بلال کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا:

”ماں! فہمید باجی کو معالج کے پاس کیوں نہ لے کر گئی آپ...؟“

ماں بے چاری کیا کہتی:

”پتر! بخار کی ایک دوا پڑی ہوئی تھی گھر میں.... وہی پلا دی تھی۔ مزید دوا کے لیے رقم کا بندوبست ابھی ابھی ہوا ہے۔ اس لیے وہ....“

بلال اچانک درمیان میں بول پڑا:

''مگر ماں! جو رقم آپ نے لال پوٹلی میں سنبھالی ہوئی تھی، وہ کیا ہوئی؟'' بلال کو تجسس تھا۔

''پتر! وہ تیری فیس کے لیے بچا رکھی ہے۔''

بلال کو جیسے ایک جھٹکا لگا ہو۔ وہ پریشانی اور سنجیدگی سے کہنے لگا:

''نہیں چاہیے مجھے فیس اماں.... !میری بہن بخار میں تپ رہی ہے اور میں خود غرض بن جاؤں؟ ہاسٹل میں پڑا رہوں؟ مجھے نہیں یہ سودا منظور اماں...'' بلال نے دکھی لہجے میں کہا، تو ماں نے فہمیدہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ فیصلہ اسی کا تھا، ویسے بھی اگر فہمیدہ کو معالج کے پاس لے گئے تو فیس کے پیسے اُدھر صرف ہو جائیں گے۔''

اماں نے تفصیل بتائی تو بلال سٹپٹا گیا۔

''بس پھر مجھے آگے نہیں پڑھنا اماں....!! یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔''

بلال کی ضد دیکھ کر ماں بے چاری پریشان ہو گئی، پھر کسی طرح اُس نے پتر کو سمجھایا کہ ایک دو گھروں سے سلائی کے پیسے آنے والے ہیں، میں کل ہی فہمیدہ کو ڈاکٹر پاس لے جاؤں گی۔ تُو میرا سوہنا فکر مت کر....'' یہ کہہ کر اماں نے فیس کے پیسے اُس کی جیب میں رکھے اور اس کے لیے کھانا تیار کرنے لگیں۔

اگلی وہ پھر سے کالج کی جانب رواں دواں تھا۔ اماں اور بہنوں سے مل کر اس بار وہ بہت اُداس تھا۔ کالج پہنچ کر بھی وہ کچھ بجھا بجھا سا رہا۔ خاص کر دو چار دن تو اس پہ بہت بھاری گزرے، پھر گھر سے بلاوا آیا کہ فہمیدہ زیادہ بیمار ہے۔ وہ جھٹ سے گاؤں روانہ ہوا۔ دماغ میں عجیب سے خیالات جنم لے رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں رب سے دعا کر رہا تھا کہ اے خدا! میری بہن کو سلامت رکھنا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے پہلا کام جو کیا، وہ یہ کہ بہن فہمیدہ کو شہر کے اچھے معالج کے پاس لے گیا۔ جہاں مہنگے علاج میں اس کی کالج فیس کام آئی تھی، لیکن اس سے یہ ہوا کہ اللہ نے اس کی بہن کو جلد شفایاب کر دیا تھا۔

بہن کو تندرست سلامت دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ اٹل فیصلہ کر چکا تھا کہ اب وہ شہر تو جائے گا مگر کالج نہیں، بلکہ کسی کام کاج کے سلسلے میں۔ اور ہوا بھی ایسے ہی.. ایک

ہوٹل میں اسے بطور ہیلپر جاب مل گئی تھی۔دو چار ہفتے سکون سے گزر گئے۔اماں کی خواہش کے مطابق پڑھائی نہ کرنے پر اُسے افسوس ضرور تھا، مگر دل میں اطمینان بھی تھا۔کیوں کہ ایک مناسب اور معقول آمدنی اسے ہر ہفتے مل جاتی تھی۔البتہ دماغ سے پڑھائی کا خیال اس نے یکسر ترک نہیں کیا تھا۔

قدرت کا کھیل دیکھیے۔ایک روز وہ ہوٹل میں گاہکوں کو ڈیل کر رہا تھا۔اچانک ایک جانا پہچانا اور شناسا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آگیا، پہلے تو اسے لگا کہ یہ شخصیت کوئی اور ہے۔مگر غور کرنے پر وہ پہچان گیا کہ یہ کالج کے پروفیسر ڈاکٹر پرویز جان ہی ہیں۔

یہ جاپان کی ایک عظیم اور نامی گرامی اوساکا یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔پھر وہاں سے شعبہ تدریس کو خیر باد کہہ کر پاکستان چلے آئے تھے۔آج کل وہ سیالکوٹ کے ڈگری کالج میں تعینات تھے۔اس کالج میں اس کی خدمات کالج انتظامیہ اور طلبا کے لیے اعزاز سمجھی جاتی تھیں۔

ڈاکٹر پرویز نے بھی پہلی ہی نگاہ میں اپنے ہونہار شاگرد کو پہچان لیا تھا۔وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے،اِدھر بلال بھی بھاگ کر اُن کے قریب پہنچا۔اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ پروفیسر صاحب کو کیسے خوش آمدید کہے۔کیسے اُن کی آؤ بھگت کرے۔

”اچھا.... تو بلال میاں! کالج میں نظر نہ آنے کی یہ وجہ تھی۔بھئی کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا؟“

پروفیسر پرویز نے شاعرانہ انداز میں شکوہ کیا۔

”وہ سر.... اصل میں..... بڑی بہن فہمیدہ بیمار تھی۔“ وہ اٹکتے ہوئے کہنے لگا۔

”تو بیٹا...!! تمھارا والد یا کوئی دوسرا بھائی اُسے دیکھ لیتا، مگر تم تو کالج میں رہتے ناں۔“ پروفیسر نے کہا۔

”سر! وہ آپ نے نجمی صاحب کا شعر سنا ہو گا ناں

ے تجھے نہ آئیں گی مفلس کی مشکلات سمجھ　　　میں چھوٹے گھر کا بڑا ہوں تُو بات سمجھ

بالکل سر جی! اسی شعر جیسی ہے اپنی بھی زندگی.... باپ سر پہ ہے نہ اور نہ ہی کوئی دوسرا

بھائی۔ گھر کے حالات کافی مخدوش ہیں۔ والدہ مجھے منع کرتی ہیں کام سے پڑھنے کا کہتی ہیں۔ میں خود بھی پڑھنا چاہتا ہوں مگر ہائے رے مفلس کی مشکلات.....''

بلال اتنا کہہ دکھی ہو گیا۔ مگر پروفیسر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ارے واہ بیٹا... ! اسی منفرد انداز، لہجے اور اپنے بہترین اسلوب بیاں کی وجہ سے تو ہم تمھیں پسند کرتے ہیں۔ بھئی تم فکر مت کرو، میں تمھیں ضائع نہیں ہونے دوں گا۔'' یہ کہہ کر پروفیسر صاحب کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بلال کی وہ دلجوئی کی کہ شاید ہی اس سے پہلے کسی نے اس انداز میں کی ہو۔ آخر وہ زبردستی بلال کی جیب میں چند ہزار روپے ڈال گئے اور جاتے جاتے نصیحت کر گئے کہ مزید چاہیے ہوں تو بلا جھجک بتا دینا۔ مگر کالج ضرور آنا، تمھاری تعلیم کا مکمل خرچ میرے ذمے ہو گا۔''

بلال پروفیسر پرویز کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سوچوں میں ایک طوفان بپا تھا۔

''کیا ایسے بھی ہوتے ہیں انسان؟ بلکہ یہ تو فرشتہ صفت ہیں۔''

اس کے دماغ میں پروفیسر پرویز کی انسان دوست طبیعت نے گھر کر لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پروفیسر صاحب نے میری دلی مراد پوری کر کے جو نیکی کی ہے۔ وہ جلد از جلد اس نیکی سے اپنی ماں کو آگاہ کرے۔

ایک ہفتے بعد بلال اسی طرح کالج کی راہداریوں کے درمیان موجود تھا۔ وہ احسان مند نگاہوں سے ڈاکٹر پرویز کو دیکھ رہا تھا۔ جو قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرنے کو تیار تھے۔ دن گزرتے گئے، بلال ذہین طالب علم تھا۔ رفتہ رفتہ وہ پروفیسر پرویز جان کے انتہائی قریب ہو گیا۔ تعلقات اور بڑھے تو پروفیسر صاحب کے گھر آنا جانا ہو گیا۔ ان کی جانب سے مالی و تعلیمی تعاون نے بلال کو پُراعتماد بنا دیا تھا۔

ایک روز پروفیسر پرویز بلال کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اچانک انھوں نے بلال سے عجیب سوال پوچھا۔

''کیا تمھیں علم ہے کہ انسان غریب کیوں ہوتا ہے؟ یا غریب کیوں رہتا ہے؟''

''سر! ایسے سوالات کے درست جوابات آپ کے سوا کس کے پاس ہو سکتے ہیں؟''

بلال نے مسکراتے ہوئے کہا تو پروفیسر پرویز بھی مسکرا دیے۔ پھر خود ہی کہنے لگے:

''بیٹا جی...!! ہم غریب اس لیے رہتے ہیں کیوں کہ ہم غریب رہنا چاہتے ہیں۔ ہم کتابی باتوں کو دماغ میں محفوظ کر کے تقدس کے اپنے اپنے بت پالنے میں مصروف رہتے ہیں، جب کہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت زندگی اور موت ہے۔اس کے بعد بڑی حقیقت بھوک ہے۔ یہ بھوک انسان کو ذلیل کروا دیتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم حقیقت پسند ہونے کے بجائے کتابی باتوں اور نام نہاد تقدیس کے بتوں کو سینے سے لگائے رکھنے کے باعث اپنے اصل کام اور اصل مشن کی طرف اپنی توجہ مرکوز نہیں رکھ پاتے۔''

پروفیسر صاحب کی تھوڑی بہت فلسفیانہ گفتگو بلال کے پلے پڑی، مگر زیادہ تر باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔البتہ اُن کے احترام میں اس نے اثبات میں سر ہلائے رکھا۔

پروفیسر صاحب نے اسے مزید بتایا کہ فی زمانہ جدید سائنس و ٹیکنالوجی پر یقین رکھنے والے لوگ ہی کامیاب و کامران ہیں۔ حقیقی ترقی بھی یہی ہے کیوں کہ اسی ترقی نے حضرت انسان کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔زندگی گزارنے کے نئے طریقے......دولت کی ریل پیل...... نئی ایجادات.... نئی اصلاحات......نئے لوگ.... نئی سوچ....نئے منصوبے...... نئی روایات اور.... نیا زمانہ...!! یہ سب کچھ جدید دور کی علامت ہے۔۔

البتہ ہمارا ملک پاکستان اور اس کے باسی ابھی تک قدیم اور فرسودہ روایات و نظریات سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ہمارے مذہبی لوگ اور اہل مدارس کبھی جدید دور اور نئی ٹیکنالوجی کا کبھی مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کبھی ایسی چیزوں کی حمایت کریں گے۔ لہٰذا ایسے قدامت پرستوں کو دور سے سلام کرنا چاہیئے، جو ملکی اور انفرادی ترقی میں سراسر رکاوٹ ہیں۔

پرفیسر پرویز جان کی گفتگو بلال بڑے غور سے سن رہا تھا۔ان کی کئی باتوں سے اتفاق نہ ہونے کے باوجود وہ اس بات کا قائل ہو چکا تھا کہ جدید تعلیم اور جدید ٹیکنالوجی ہی ہماری ترقی کی ضامن ہے۔اور اس میں رکاوٹ جو بھی بنے وہ جاہل اور گنوار انسان ہے۔

ہاسٹل میں واپس پہنچ کر بلال اپنے بستر پر دراز ہوا تو رات گئے وہ پروفیسر صاحب کی باتوں پر غور و خوض کرتا رہا۔ اُسے پروفیسر صاحب کی شکل میں ایک شفیق انسان اور راہنما میسر آگیا تھا۔ اُن کی مفکرانہ سوچ کا وہ قائل ہوتا چلا جا رہا تھا۔

کچھ ماہ یوں ہی گزر گئے۔ بلال اب پہلے سے زیادہ سوچ بچار کا عادی ہو گیا تھا۔ پہلے جہاں اسے پروفیسر صاحب کی نصف باتوں سے اتفاق ہوتا تھا، کچھ عرصہ بعد ہی یہ اتفاق تقریباً نوے فیصد تک پہنچ گیا تھا۔ حالانکہ اب تو پروفیسر صاحب کی باتیں پہلے سے بھی سخت ہوتی تھیں۔

اس بار بلال جب گاؤں گیا، تو کچھ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ بلال کی ماں اور بڑی بہن فہمیدہ نے بھی یہ بات نوٹ کی، لیکن سب سے بڑی تبدیلی جو بلال میں دیکھنے کو ملی، وہ عمل تھا ترکِ عبادات...!!

بلال جیسا شریف لڑکا جو پہلے باقاعدگی سے صوم و صلاۃ کا پابند تھا۔ اب اسے ایسی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کے کئی کلاس فیلوز اُسے نمازی اور نعتیں پڑھنے والے طالب علم کے حوالے سے جانتے پہنچانتے اور اسی سے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پَر وہ ایسی تمام سرگرمیاں رفتہ رفتہ ترک کر چکا تھا۔ صحبت کی تبدیلی کا اثر براہِ راست اُس کی ذات پر پڑ رہا تھا، لیکن وہ خود کو مطمئن تصور کر رہا تھا۔

گاؤں میں بڑی بہن فہمیدہ کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ سادگی سے شادی کے عالم میں بھی کئی ایسی ضروریات ہوتی ہیں، جن کے عوض اچھی خاصی رقم چاہیے ہوتی ہے۔ اکیلی ماں کے بس کی تو بات ہی نہیں تھی۔ لڑکیوں نے سلائی کے تمام بقایاجات اور جمع پونجی سامنے رکھ دی۔ رقم پھر بھی کچھ کم تھی، ماں نے تو ہمت نہ ہاری اور اللہ سے مدد مانگتی رہیں۔ البتہ بلال کے لیے اب ایسی چیزیں متاثر کن نہیں تھیں۔

چناں چہ وہ بلند آواز میں ماں سے جھگڑنے لگا:

"ماں...! دعاؤں سے کچھ بدلنا ہوتا، تو آج تک ہمارے حالات نہ ٹھیک ہو جاتے؟ دو وقت کی روٹی پوری کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ پر یہ تقدیر اور دعا وغیرہ۔ ایسی باتیں تو اب بے کار لگتی ہیں

مجھے۔"

ماں اپنے پتر کے ان خیالات سے ہکا بکا رہ گئی۔ فہمیدہ الگ غصے سے لال پیلی ہوئے جا رہی تھی۔ البتہ بلال فضول گوئی کی تمام حدیں اب پار کیے جا رہا تھا۔ ماں نے استغفار کرتے ہوئے اُسے ڈانٹا تو وہ بجائے سدھرنے کے مزید بگڑ گیا۔

گھر میں خوب ہاہاکار مچی، اِک ہنگامہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ بلال منہ پُھلائے، بغیر بتائے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ گھر میں تنگدستی کی وجہ سے یہاں اُس کا دَم گھٹنے لگے گا۔ کالج سے تو آج کل بڑے دنوں کی چھٹیاں تھیں۔ اس لیے ہاسٹل میں جانا ممکن نہ تھا۔ لاچار وہ گھومتا پھرتا پروفیسر پرویز جان ہی کے گھر تک جا پہنچا۔ بلال کا پُرتپاک استقبال ہوا۔

اس کی زبانی ساری رام کہانی سننے کے بعد پروفیسر صاحب مسکرائے: "بس یہی مسئلہ تھا؟"

یہی چیز اسے پروفیسر پرویز کے مزید قریب کرتی تھی، یعنی مسئلہ جتنا مرضی بڑا ہو، مگر مجال کے کبھی انھوں نے پریشانی ظاہر کی ہو۔ بلکہ پریشانی میں آنے والا کوئی بھی انسان پروفیسر صاحب سے مل کر فوراً اپنی پریشانی بھول جاتا تھا۔ آج بلال کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب نے بلال کو اپنے پاس بٹھایا اور اس سے اس کے دل کا حال معلوم کرنے لگے۔ بلال جو کہ پریشانی کی وجہ سے اچھا خاصا مایوس تھا۔ پروفیسر صاحب کو اپنا خیر خواہ سمجھ کر اپنے تمام حالاتِ زندگی ان کے سامنے رکھنے لگا۔ اسی وقت پروفیسر نے ایک فیصلہ کیا۔ اپنے ساتھ ایک اچھی خاصی رقم جیب میں رکھی اور گاڑی نکال لی۔

"بیٹھو بلال۔۔!" پروفیسر نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، مگر بلال کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کہاں جانا ہے، البتہ جب پروفیسر نے پیار سے دوبارہ کہا تو وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اُن کا رخ اب بلال کے گھر کی جانب تھا۔ یہ دیکھتے ہی اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دوبارہ دکھائی دینے لگے۔ مگر پروفیسر صاحب نے اسے تحمل کا مظاہرہ کرنے کو کہا۔

گاڑی گھر کے سامنے رکی۔ کچھ دیر بعد وہ گھر میں موجود تھے، جہاں بلال کے گھر والے پروفیسر صاحب کو خوش آمدید کہنے کو موجود تھے۔ علیک سلیک کے بعد پروفیسر نے ماں جی کو بیٹی کی

شادی کی مبارکباد دی اور گھر والوں کے انکار کے باوجود کئی ہزار روپے اُن کی نذر کر دیے۔ ماں تو بلال کے استاد سمجھ کر اس "فرشتہ صفت انسان" کے لیے لبوں پہ دعا سجائے ہوئے تھی۔ واقعی مشکل وقت میں جب اپنے بھی ساتھ چھوڑ جائیں، تو ایسے مشکل وقت میں مالی تعاون کرنے والا آدمی فرشتہ ہی تصور کیا جائے گا ناں۔

ایک گھنٹے بعد سب کچھ نارمل تھا۔ بلال کے چہرے سے بھی پریشانی غائب ہو چکی تھی۔ گھر والوں نے پروفیسر کی خوب آؤ بھگت دی، یوں لگ رہا تھا کہ پروفیسر انہی کے خاندان کا حصہ ہے۔ فہمیدہ کی شادی بخریت انجام کو پہنچی۔ کچھ یوم بعد پروفیسر نے بلال کو اپنے گھر دعوت دی۔ ضیافت میں پروفیسر صاحب کے کچھ اور مہمان بھی شامل تھے۔ جنھیں بلال نہیں جنتا تھا۔ کھانے کے دوران وہ ساتھ ساتھ گفتگو بھی کر رہے تھے۔

باتوں ہی باتوں میں موضوع مذہب کی طرف چلا گیا۔ محدثین کا تذکرہ شروع ہوا، تو پروفیسر صاحب نے کچھ محدثین کے بارے میں نہایت بدلحاظی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ اس طرح کی گفتگو بلال کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن اچانک ایک اور مہمان نے اپنا منہ کھولا۔

منہ کیا کھولا، گویا گٹر کا ڈھکن اٹھا دیا ہو۔ ایسی بدبودار گفتگو کہ شیطان بھی حیران جائے۔ مذکورہ مہمان گندی گالی دیتے ہوئے اماچانک امام بخاری کا ذکر چھیڑا تھا۔ اس بد تہذیبی اور واہیات پر پروفیسر سمیت دیگر لوگوں نے قہقہے نچھاور کیے تھے۔ بلال جسے اب پروفیسر کی ہر بات حرف آخر لگتی تھی، اس بار کچھ گڑبڑا گیا تھا۔

"کیا ہوا بلال...!! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟"

اچانک پروفیسر نے پوچھا تو اس نے فوراً نہیں کہہ کر خود کو نارمل کر لیا۔ اس کے بعد پروفیسر نے امام بخاری بارے شکوک و شبہات اور کچھ احادیث کے غلط معنی و مطالب پیش کرنا شروع کیے۔ ایک تو ان باتوں سے ناواقف تھا، دوسرا یہ کہ وہ پروفیسر کے احسانات تلے دبا ہوا تھا۔ سو خاموشی سے سر ہلاتا رہا۔ پروفیسر گفتگو کے ساتھ ساتھ اس کی حرکات کو نوٹ کر رہا تھا۔ محفل کا اختتام ہوا۔

اس شام بر گزیدہ اسلامی شخصیات کا نہایت بد تہذیبی کے ساتھ مذاق اڑایا گیا تھا، مگر بلال پروفیسر کی رحم دلی اور احسانات کی وجہ سے خاموش تھا، ویسے بھی اسے اب مذہب سے اتنی دلچسپی رہی نہیں تھی۔ وہ گھر واپسی کی راہ لینے لگا تو پروفیسر نے چپکے سے جیب خرچ کے طور پر تھوڑی رقم اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ بس ناں ناں کہتا رہ گیا، مگر پروفیسر نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ خیر وہ پروفیسر صاحب کو دعائیں دیتا گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس کے بعد پھر اس طرح کی بد تہذیبی والی گفتگو ان کی محفلوں کا خاصا بن گئی۔ یہاں تک کہ موجودہ تمام برے حالات کا ذمہ دار مولویوں کو قرار دے کر ڈاڑھی، ٹوپی اور پگڑی کا مذاق اُڑانا معمولی بات تھی۔ سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ بلال ان تمام سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ کیوں کہ اسے یہاں ''عزت'' ملتی تھی۔

لیکن بات جب رفتہ رفتہ انبیا کے مشن اور مسیح موعود کی آمد جیسے موضوعات کی طرف نکلنے لگی، تو ایک بار بلال کو کچھ کھٹکا لگا۔ اسے قدرے احساس ہوا کہ شاید زندگی کی ٹرین غلط پٹڑی پر چلنے لگی ہے۔ اس بات کا ذکر بد قسمتی سے بلال نے پروفیسر ہی سے کر دیا۔ یعنی اسی عطار کے لونڈے سے دوا لینے والی بات تھی۔ پروفیسر نے دیکھا کہ بلال کو ورغلانے میں بہت وقت اور پیسہ لگا ہے، اب کہیں یہ ''مچھلی'' جال میں آئی ہے، کہیں یہ ہاتھ سے پھسل ہی نہ جائے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے اس نے ایک اور منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔

اگلے دن جب وہ پروفیسر کی ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا، تو کچھ لمحوں بعد ایک خوبصورت دوشیزہ اپنے حسن کا جلوہ دکھانے ہاتھ میں چائے لیے بہ نفس نفیس ڈرائنگ روم میں چلی آئی، اسے دیکھ کر بلال کو لگا کہ اس کا سانس بند ہو جائے گا۔ قدرت نے اس لڑکی کو بہت حسین بنایا تھا۔ لڑکی واپس گئی، تو بلال نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، پروفیسر نے بلال کی حالت دیکھ کر قہقہہ لگایا اور چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہنے لگا:

''بلال! یہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔ مجھے اپنی اس ذہین اور خوبصورت بیٹی پر بڑا فخر ہے۔ اس کے لیے مجھے ایک بہادر، اور اچھے خیالات کا حامل لڑکا چاہیے، جس کی سوچ، فکر اور تخیلات مجھ سے ملتے

ہوں۔ چاہے وہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔" بلال کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ پروفیسر یہ سب باتیں اُسے کیوں بتارہے ہیں۔ خیر اس نے اپنے جذبات چھپانے کی کوشش کی اور بولا:

"سر! پھر تو وہ جو بھی ہوا، بہت خوش قسمت ہی ہوگا۔"

"ہاں! واقعی، خوش قسمت ہوگا۔ کیوں کہ میری بیٹی لاکھوں نہیں، کروڑوں میں ایک ہے۔"

پروفیسر نے کہا اور کچھ لمحے توقف کے بعد دوبارہ کہنے لگا: "کبھی مجھے کبھی لگتا ہے کہ تمھارے نظریات اور سوچ بھی بالکل میری طرح ہیں، تم جیسا ذہین انسان میری بیٹی کا شوہر ہونا چاہیے، مگر کبھی کبھار خیال آتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میرے نظریات کے باغی نکلو۔ مگر ہو تو تم بہت باکمال لڑکے۔"

پروفیسر نے نہایت چالاکی سے جال پھینکا تھا۔ بلال بے چارہ اس اچانک لفظی حملے سے گھبرا کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ پہلے ہی دوشیزہ کے حسن کی تباہ کاری کا شکار ہو چکا تھا۔ مگر اس نے ہمت کی اور پروفیسر کی بات کا جواب دینے لگا۔

"سر! آپ جیسے بندے کی رحم دلی، خیالات اور نظریات سے کوئی بد قسمت انسان ہی اختلاف کرے گا۔ میری بھلا کیا مجال۔"

بلال کو جال میں مکمل پھنستا دیکھ کر پروفیسر کے چہرے پر مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگا: "بھئی! مجھے تمھاری فطرت کا علم ہے، تم تو میرے بیٹوں کی طرح ہو، اور مستقبل میں داماد بھی شاید۔"

پروفیسر کی بات پر بلال کا جسم کانپنے لگا۔ مگر وہ بے حد خوشی محسوس کر رہا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ اگلے دو ماہ میں بلال مکمل طور پر پروفیسر پرویز جان کے فتنے کا شکار بن چکا تھا۔ وہ اب کالج کے ایک عام طالب علم کے بجائے کسی نئی سوچ کا مبلغ اور مفکر دکھائی دیتا تھا۔ کچھ قریبی دوست بلال میں اس تبدیلی کو نوٹ کر چکے تھے۔ مگر بہت سے دوستوں کے نزدیک بلال ابھی بھی وہی بھولا بھالا نعتیں پڑھنے اور تلاوت کرنے والا لڑکا تھا۔

ایک روز کالج انتظامیہ کو کچھ اساتذہ نے شکایت پہنچائی کہ پروفیسر پرویز جان کلاس میں مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات پر مبنی گفتگو کرتے ہیں۔ یہ طلبا کو سکھاتے ہیں کہ رحمت تو ہمیشہ اور سدا ہوتی ہے، لیکن جب نبی کریم ﷺ کی وفات ہوگئی اور ان کی نبوت ختم ہوگئی تو گویا رحمت بھی ختم ہوگئی۔

اور پھر یہ کہ نبی کریم ﷺ کو ہم آخری نبی مانتے ہیں مگر پھر عیسیٰ علیہ السلام آخر میں کیوں تشریف لائیں گے ؟یعنی ایسی شکوک وشبہات والی باتیں جو عام طالب علموں کے سر سے گزر جائیں پروفیسر صاحب پر ایسی باتیں کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔مزید یہ بھی کہ وہ قادیانی لٹریچر کی تبلیغ اور نشرو اشاعت کے مرتکب بھی پائے گئے ہیں۔

کالج انتظامیہ نے اس معاملے کی مکمل جانچ کرنے کے بعد پروفیسر پرویز کے لیکچر دینے پر پابندی لگادی۔ کلاس کے کچھ بھولے طلبا و طالبات اس پابندی کے حق میں نہیں تھے۔انھوں نے اس مذہبی مسئلے کے لیے بلال سے راہنمائی لینے کا فیصلہ کیا، جوان کے نزدیک ایک مذہبی طالب علم تھا۔بلال نے دس پندرہ طلبا وطالبات کی کینٹین میں دعوت رکھی۔

تقریباً سولہ لڑکے اور لڑکیاں اس دعوت میں شریک ہوئے،اس کا تمام خرچہ بلال نے اپنے ذمے لیا تھا۔اپنے ساتھ طلبا وطالبات کے چہروں پر پریشانی کا سماں دیکھ کر بلال نے وہاں مختصر بات چیت کی اور کہنے لگا:

"دوستو!دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی پوری دنیا کو اپنے ثمرات سے منور کررہی ہے، ہر چھوٹا بڑا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ایک ادھر ہم ہیں کہ کافر کافر، حلال حرام اور زندہ باد مردہ باد میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ عجب تماشاہے بھئی، یہ فتویٰ کی دکانیں اب بند ہونی چاہئیں۔"

بلال اپنے دوستوں اور کلاس فیلوز سے مخاطب تھا۔

"آپ سب جانتے ہیں کہ ایسے سب حالات اور ایسے سب نعرے ہمارے رجعت پسند مولویوں کی طرف سے دیے جاتے ہیں۔ان کا ایک ہی مقصد ہے کہ ہم نوجوان ہمیشہ مسجد کے ممبر و محراب سے چمٹے رہیں اور ان کے چندوں کا انتظام ہوتا رہے۔ اگر آج ہم نے ذرا سی بھی کوتاہی

اور غفلت دکھائی، تو یہ لوگ ہم پر غالب آجائیں گے۔ پروفیسر پرویز جان کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا، وہ ترقی پسند اور جدید ذہن رکھنے والے انسان ہیں۔ ہمیں ان کے حق میں آواز اٹھانی ہو گی۔"

بلال کی محض اتنی سی گفتگو نے کئی تذبذب کا شکار ذہنوں کو یکسو کر دیا۔

اب سبھی طلبا و طالبات دل و جان سے پروفیسر پرویز کی بحالی کے لیے مہم چلانے لگے۔ پلے کارڈز اٹھا کر اس کے حق میں نعرے بازی کرنے لگے۔ اس دوران انھیں اپنے ذاتی اخراجات کے لیے اچھے خاص "فنڈز" بھی مہیا ہوتے رہے، مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ فنڈز کون دے رہا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ اس ساری رقم کا انتظام پروفیسر صاحب اور ان کی نازک اندام حسینہ بیٹی کی طرف سے ہوتا تھا۔ یعنی بلال جس کی نام نہاد محبت کے چنگل میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ وہ دین و دنیا سے ماوریٰ دونوں باپ بیٹی کے ہر اشارے پر خود کو پیش کر رہا تھا۔

یہ واقعی خطرناک بات تھی۔ ایسے نہ جانے کتنے قادیانیوں نے چھوٹی محبتوں اور شادیوں کے لالچ میں بھولے بھالے مسلمان نوجوانوں کو گمراہ کر رکھا ہو گا۔ بلال اس کی زندہ اور تازہ مثال تھا، جس نے پروفیسر کی بحالی مہم کو خوب پروان چڑھایا تھا۔

طلبا و طالبات کے احتجاج کے بعد اوپر ہی اوپر میڈیا رپورٹس بنائی گئیں۔ سرکاری طور پر پرچیاں اور سفارشات چلیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے کفریہ لابی نہتے مسلمانوں پر غالب رہی، کیونکہ پروفیسر پرویز کو بحال کر دیا گیا تھا، مگر اب وہ پہلے سے محتاط ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے ہم نوا ساتھیوں سے مل کر دوبارہ خفیہ اور اعلانیہ قادیانیت کی ترویج و تبلیغ دوبارہ سے شروع کر دی۔ جو کہ پاکستانی قانون کی بھی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی، لیکن اسے ڈر تھا کہ اب کوئی سرپھرا اسے جان سے نہ مار دے۔ چناں چہ اس نے اپنا بوریا بستر سمیٹا اور سویڈن میں شفٹ ہو گیا۔ مگر جانے سے پہلے وہ اپنے تربیت یافتہ طالب علموں کو ملک کی مختلف یونیورسٹیز میں داخل کروانا نہیں بھولا تھا۔

پروفیسر کی اچانک سویڈن روانگی جہاں سب کے لیے حیران کن تھی وہیں ایک بات سب کو اور بھی پریشان کر رہی تھی کہ بلال جیسا طالب علم آخر پروفیسر پرویز جان کے ساتھ سویڈن کیا

کرنے گیا؟

بلال کے گھر والوں کو ساری صورتِ حال کا علم ہوا تو اس کی بہنیں سر پیٹ کر رہ گئیں۔ ماں کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جس پروفیسر کو انھوں نے اپنا محسن اور فرشتہ صفت سمجھا تھا، وہ تو آستین کا سانپ نکلا تھا۔ اس گھرانے کو دوہرے غم نے مار کر رکھ دیا تھا۔ ایک تو جوان بیٹے کی جدائی اور بے وفائی اور دوسرا اس کا قادیانی چنگل میں پھنسنا۔

ماں کا رو رو کر برا حال تھا۔ اللہ کے حضور وہ اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے معافی کی امید لیے ہوئے تھی۔ اس کی صبح و شام دعاؤں میں جہاں بیٹے کی واپسی اور ہدایت کا ذکر ہوتا، وہیں اس بھیڑیے نما پروفیسر کے لیے بد دعائیں ہی بد دعائیں تھیں۔ جس نے انھیں اندھیرے میں رکھ کر ان کا بیٹا چھین لیا، اس کا ایمان چھین لیا۔ یعنی کہ دنیا و آخرت ہی چھین لی تھی۔

کئی برس بیت گئے۔ بلال کا صرف اتنا معلوم ہوا کہ پروفیسر کی بیٹی سے شادی کے بعد وہ امریکہ شفٹ ہو گیا تھا۔ جب کہ پروفیسر نے سوشل میڈیا پر موجود پاکستان کے بھولے بھالے نوجوانوں کو اپنا ٹارگٹ بنا لیا تھا۔ بعد ازاں پروفیسر پرویز خود تو یورپ چلا گیا مگر یہاں پاکستان میں اپنی باقیات چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے کتنے اس جیسے غلیظ کردار استاد کے روپ میں اپنا خفیہ مشن جارے رکھے ہوئے تھے اور نہ جانے کتنے نیک سیرت بلال لالچ و گمراہی کی دلدل میں پھنس کر قادیانیت کے مکر و فریب کا نشانہ بن چکے ہیں۔

بطور مسلمان ہمارے لیے بھی اس واقعہ میں سبق ہے کہ اپنی وقتی اور عارضی پریشانیوں کے آگے ہتھیار ڈال کر چند ٹکوں کی خاطر سیدھے راستے سے بغاوت کرنا صرف اور صرف تباہی ہے۔ دینی طور پر بھی اور دنیاوی طور پر بھی۔

اور آخرت میں تو اس تباہی کو کچھ حساب و کتاب ہی نہیں ہے۔ نہ جانے ایسے ہمارے کتنے کاروان لٹ چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسلامیانِ پاکستان کو قادیانی فتنے کی چال بازیوں سے بچائے اور ہمیں حقیقی طور پر نبی کریم ﷺ سے محبت و الفت کرنے والا پکا اور سچا مسلمان بنائے، آمین۔

☆....☆....☆